علامہ جمیل مظہری: حیات وخدمات کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر سورج دیو سنگھ

دبستانِ عظیم آباد کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ یہاں کی سرزمین نے اردو ادب کی آبیاری میں بے حد اہم رول ادا کیا ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک معتبر شخصیات کو پیدا کیا ہے۔ جن میں سے کچھ نے اردو نثر نگاری کے میدان میں اپنا نام روشن کیا تو بعض نے اردو شاعری کے گل بوٹے کھلا کر دبستانِ عظیم آباد کی پہچان بین الاقوامی صطح پر کرائی۔ علامہ جمیل مظہری انہیں نامور ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی شہرت ومقبولیت کا سفر آج بھی جاری ہے۔

سید کاظم علی نام اور جمیل مظہری تخلص ۱۹۰۴ء میں مغل پورہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں سہولت کے لئے ان کی سنِ ولادت کی تاریخ یکم جنوری ۱۹۰۵ قرار پائی ہے۔ جمیل مظہری کا تعلق جس عہد سے تھا اسی عہد میں ان کے ہمعصر شعرا مثلاً اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی اردو ادب کے افق پر اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہوئے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جمیل مظہری اس زمانے میں وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ ایک طویل عرصے تک گوشہء گمنامی میں رہنے کے بعد جمیل مظہری کو ادبی دنیا میں اپنا مقام ومرتبہ بنانے میں کامیابی ملی۔ لیکن وہ میر تقی میرؔ کے مندرجہ ذیل شعر کو صادق کرتے ہوئے خاموشی سے اپنا کام سرانجام دیتے رہے۔ شعر ملاحظہ ہو:-

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا،
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا۔

ظاہر ہے اب جمیل مظہریؔ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہم ان کے اشعار پر آج بھی اپنا سر دھونتے ہیں اور اردو شاعری میں ان کی شہرت ومقبولیت کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے گوشہء گمنامی میں رہنے کی ایک اہم وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو شہرت کے لئے اشتہار بازی کو اپنے پاس کبھی پھٹکنے نہیں دیا۔ اس دور میں شعرا مختلف گروپوں میں بٹے ہوئے تھے اور شاعری، شاعری نہ ہوکر پروپیگنڈہ بن کر رہ گئی تھی۔ چونکہ وہ فطرتاً گوشہء نشین اور تنہائی پسند شاعر تھے اس لئے وہ سب سے الگ تھلگ پڑے رہے۔ ان کا نام کبھی کسی گروپ یا جماعت سے وابستہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ چھپنے چھپانے اور مشاعروں سے بھی ان کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ شاید انھیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے دنوں میں شاعری کے قدردان ضرور ملیں گے۔ واضح رہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمیؔ اور نیاز فتح پوریؔ ان کی شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جمیل مظہریؔ نے کبھی دوسرے درجہ کی چیزیں نہیں لکھی۔ وہ بہت ہی سنجیدہ، متین اور فلسفیانہ شخصیت کے مالک تھے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے جمیل مظہریؔ کوئی غیر معروف نام نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت بھی کی اور وطن کی آزادی کے مجاہد بھی رہے۔۔ غرض کہ ان کی شخصیت میں کئی چیزیں ایک ساتھ شامل ہوگئی تھیں۔

کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی انھیں شعروسخن سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ابتدائی زمانے میں اپنے کلام پر استاد رضا علی وحشت سے اصلاح لیا لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔انھوں نے خود پر بھروسا کیا اور آزادانہ طور پر شاعری کرنے لگے۔ان کی پہلی باقاعدہ نظم 'مالن کی بیٹی' کلکتہ کے رسالہ نشتر میں ۲۵-۱۹۲۴ میں چھپی تھی جو نقشِ جمیل میں شامل ہے۔صحافت کے دوران انھوں نے متعدد سیاسی وعلمی مضامین لکھے۔ظاہر ہے اسی زمانے میں جنگِ آزادی کے متوالوں سے ان کا رابطہ ہوا۔لیکن صحافت اور اخبار نویسی شاید ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اس لئے اس سے علاحدہ ہوگئے اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں استاد کا منصب قبول کیا اور ۱۹۵۰ سے لیکر ۱۹۶۴ء تک پٹنہ کالج سے وابستہ رہے۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے خود کو شعروادب کی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ان کی تخلیقات میں شکست وفتح (طویل افسانہ) ۱۹۵۰ء، نقشِ جمیل (نظمیں) ۱۹۵۳ء، فکرِ جمیل (غزلیات، گیت، رباعیات، قطعات) ۱۹۵۹ء، عرفانِ جمیل (مراثی، قصاید، سلام) ۱۹۶۹ء، عرفانِ جمیل (ہندوستانی اڈیشن) ۱۹۷۹ء، آب وسراب (طویل فلسفیانہ مثنوی) ۱۹۷۰ء میں اور وجدانِ جمیل (مراثی اور ملّی نظمیں) ۱۹۷۸ء میں وغیرہ ان کی ادبی یادگار ہیں۔

جمیل مظہری نے تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر تھے۔جمیل مظہری جس دور میں بحیثیت شاعر ابھرے وہ غزلوں کے مقابلے میں نظموں کی ترقی کا دور تھا۔پھر بھی جمیل مظہری کی غزلوں کا سرمایہ نظموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ان کی غزلوں کو سمجھنے کے لئے ان کے فکری رجحانات کو پیشِ نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔وہ ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہوئے۔'جہنم سے' اور 'آب وسراب' ان کی دو مشہور مثنویاں ہیں۔بعض ناقدین کا خیال ہے کہ 'آب وسراب' اردو ادب کی مثنوی نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔علاوہ ازیں 'فرض کی قربان گاہ' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا۔پروفیسر وہاب اشرفی اپنے ایک مضمون بعنوانِ 'جمیل مظہری کی غزل گوئی' میں رقمطراز ہیں:-

''اقبال کے یہاں روشنی استعارہ ایمان وآگہی کے لئے ہے۔اس کے برخلاف جمیل مظہری تیرگی کو جدلیاتی معنی بخش دیتے ہیں۔''

اس میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں کہ جمیل مظہری کا عہد ہندوستان میں سیاسی بیداری کا عہد تھا۔چونکہ ان کی تعلیمی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزرا اس لئے اس دور کے انقلابیوں اور مجاہدین سے بھی ان کی دید وشنید ہوگئی تھی۔وہ انقلابی ماحول سے نہ صرف پوری طرح آشنا تھے بلکہ اس دور کے انقلابی خیالات کا ان کی شاعری پر اثر بھی پڑا اور ان کی فکری تشکیل میں بھی اس ماحول نے اہم رول ادا کیا۔ان کی شاعری کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ہندوستان میں جنگِ آزادی کی جدوجہد پورے شباب پر تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر وفن پر انقلابی اور سیاسی قدروں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ان کا فن اس وقت اور نکھر جاتا ہے جب وہ زندگی کے بنیادی حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جمیل مظہریؔ نے پرویز شاہدیؔ، مخدوم محی الدینؔ، احسان دانشؔ، فیض احمد فیضؔ اور فراق گورکھپوریؔ جیسے ساتھیوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر جنگِ آزادی کی لڑائی کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس دور کے جن شعراء نے ہندوستان میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا اور آزادی کی تحریک کو پروان چڑھایا ان میں ایک اہم نام علامہ جمیل مظہریؔ کا بھی ہے۔ انھوں نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس دور میں دو اہم نظریے یا دو دھارے صاف طور سے دکھائی پڑتے ہیں۔ ایک وہ جس میں کلاسکیت عجمی اور فکر کی گہرائی کی کارفرمائی ہے اور دوسرے نظریہ میں بے چینی، تبدیلی، انقلاب اور عصری تقاضے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ظاہر ہے دونوں نظریے ہی کسی معاشرے کے لئے بے حد اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک وہ نظریہ جس میں قدیم شعرا نے اردو شاعری کی آبیاری کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات و تجربات کے نقش چھوڑے ہوں گے جن کی تلاش نئے شاعروں کے لئے ضروری ہے اور ان کو سنبھال کے رکھنا بھی اہم۔ دوسرے نظریے میں آنے والی نئی نسلوں کے لئے ایک صاف ستھرا ماحول، تعلیمی بے داری اور سکون آمیز معاشرے کی تشکیل کرنے کا حوصلہ وارادہ دونوں موجود ہے۔

انہیں دونوں نظریوں کے درمیان علامہ کی شاعری پروان چڑھتی ہے اور ہم صاف طور پر دیکھتے ہیں کہ انھوں نے تواریخ کا مطالعہ و ذاتی تجربہ کی بنیاد پر دونوں نظریوں کی تائید کرتے ہیں اور دونوں دھارے ان کی شاعری میں یکساں طور پر رواں دواں ہیں بلکہ یوں کہیں کہ دونوں کی مشترکہ تصاویر ان کی شاعری میں دکھائی پڑتی ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری میں گہرے افکار، جمال، تلاشِ ذات اور منفرد اندازِ بیان کا رنگ نمایاں ہے مگر فن میں بلا کی نغمگی اور بیان کرنے کے نرالے ڈھنگ، طرزِ ادا میں نیا پن یہ تمام خوبیاں ان کے یہاں موجود ہیں جو دیگر شعرا سے انہیں الگ و بلند مقام عطا کرتے ہیں۔ فلسفیانہ فکر اور تنقیدی ذہن کے مالک جمیل مظہری کی نظر میں شاعری کی جو تعریف ہے وہ ان کی اپنی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''شاعری نام ہے جذبات کی ترجمانی کا، منظوم ترجمانی کا۔۔۔۔۔ کیونکہ شعر تو اسی کو کہا جائے گا جو عروض کی زنجیر کا پابند ہو اور عروض کی یہ بابستگی کیا ہے؟ اصوات کا باہمی توازن اور الفاظ کی موسیقیانہ تنظیم جو بجائے خود اس کی شہادت ہے کہ شاعری ہی وہ اکلوتی بیٹی ہے جو موسیقی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔''

اس اقتباس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ علامہ کی فکر شاعری کے حوالے سے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ تکنیکی ضرورتوں کو خاص طور سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ اس طرح کی باریکیوں پر کسی کی نظر جاتی ہو یا نہیں مگر جمیل مظہری نے شاعری کے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ جو بھی تخلیقات وجود میں آئے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قبول ہو۔ گویا عروض کی پابندی، زبان و بیان کا بہتر استعمال، خیال میں عمدہ پن اور فکر میں گہرائی ہو۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ الفاظ کے عمدہ انتخاب سے انداز و بیان میں جان پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی شاعر کے لئے جو تین شرطیں لازمی قرار دی ہیں ان میں تخیّل، مطالعہ کائنات اور تفحصِ الفاظ ہے۔ ظاہر ہے علامہ

کے مزاج کی پہچان اور جمالیات کی شناخت ان کے کچھ مخصوص بیان کردہ الفاظ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جوان کی مقبولیت و محبوبیت کے لئے اہم رول ادا کئے ہیں۔ جمیل مظہری کے یہاں ایسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو آہستہ نرم اور مدھم ہونے کے ساتھ ہی دلوں میں فوراً داخل ہونے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ مثلاً رحمت، آنسو، شمع، شکست، خلش، سوز، نگاہ، اندھیرا، تشنگی، خرمن، لپٹوں، صورت، زخم اور افسوں وغیرہ۔

جمیل مظہری نے اپنی شاعری میں ہر طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کا بہترین تجربہ کیا ہے۔ یہ اپنے دلکش اسلوب کے بدولت خشک موضوع کو بھی دلچسپی بھرا بنا دیتے ہیں۔ خواہ وہ سیاست کا ہی موضوع کیوں نہ ہو۔ چونکہ احساس کی شدت، صداقت اور سوز و گداز کی باہمی آمیزش نے پتھروں کو بھی موم بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ انوکھا تجربہ ان کی فکری صلاحیت اور موضوعات میں ڈوب جانے کے سبب عمل میں آیا ہے۔ یہ ہر واقعہ کو اپنی زندگی کا اہم حصہ مانتے ہیں۔ جس سے ان کے کلام میں سوز و گداز کا خود بخود پیدا ہونا فطری عمل معلوم ہوتا ہے اور یہی داخلیت کا وہ نایاب کارنامہ ہے جس سے جمیل مظہری بے جان چیزوں میں بھی روح پھونک دینے میں کامیاب ہیں۔

ذرا ان کی عشقیہ نظموں کو دیکھا جائے کہ کیا واقعی ان میں شدتِ احساس، صداقت، عشق و محبت اور محبوب کا واضح نقش وغیرہ پر کس قدر ذاتی تجربات کی جھلک دکھائی پڑتی ہے اور لہجے میں کہیں تصنع و بناوٹ نہیں ہے۔ عشق کی ابتدا میں جو کشمکش اور بے چینی پیدا ہوئی ہے اس کی مثال پر غور کیجئے۔

آئینہ میں دیکھوا پنی صداقت
نظروں میں جھجھک زبان میں لکنت
پندار میں بے خودی کی حالت
کہتے ہیں اسی کو کیا محبت
چتون کے جھکاؤ میں ایشارہ
آنکھوں میں آج دل ہمارا
خاموشی میں گفتگو کی شدت
کہتے ہیں اسی کو کیا محبت

اس پوری نظم میں جو تصویر بیان کی گئی ہے وہ حقیقت کے لحاف اوڑھے ہوئے محبت کی وہ کہانی بیان کر رہی ہے جو ابتدائے عشق میں رونما ہوتے ہیں اور تقریباً ہر انسان اس کو بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے۔ یہی حقیقت پسندی اور اس کا خوبصورت بیان علامہ کی شاعری کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔ جمیل مظہری کے یہاں عشقیہ نظموں میں فنی خوبیوں کے علاوہ

زبان و بیان میں دلکشی پر خاص توجہ دی گئی ہے تو ایسا نہیں کہ دوسرے موضوعات کو یوں ہی بیان کر دیا گیا ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے باوجود اس کے ان کے ہر موضوع میں ندرت اور بیان میں جادوگری کی سی کیفیت پائی جاتی ہے جو سوئے ہوئے جذبات کو بھی جگانے میں مدد کرتی ہے۔ حوصلوں سے بھرا اور جہد مسلسل زندگی کی سچائی کی ایک تصویر ان کی مشہور نظم 'بھارت ماتا' میں الفاظ کے انتخاب اور گہری سوچ کا بھرپور پتہ دیتی ہے۔

اک آگ لگی ہے دنیا میں گر داڑتی ہے لو چلتی ہے
مغرب سے لیکر مشرق تک آدم کی کھیتی جلتی ہے
اب وقت نہیں ہے سونے کا اے غفلت کے پالو جاگو
اے ہند کے فرزندو جاگو، اے غفلت کے پالو جاگو
جس آگ کے لپٹوں نے بڑھ کر تہذیب کا دامن پکڑا ہے
اخلاق کے خرمن پھونکے ہیں فطرت کا کلیجہ جھلسا ہے
اس آگ کے شعلے تھام چکے بھارت ماتا کے آنچال کو
امید کی نظریں ڈھونڈتی ہیں رحمت کے برستے بادل کو
اس آگ کو گل کرنے کے لئے رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم
رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم شاعر کی دعا بن جاؤ تم

حب الوطنی کے جذبے سے لبریز یہ نظم جوش و ولولہ سے بھری ہوئی ہے۔ ہندی اردو کے الفاظ کی آمیزش نے اس کو پرلطف بنا دیا ہے اور کسی بھی سوئے ہوئے دل کو جگانے میں یہ نظم پوری طرح کامیاب ہے۔ جمیل مظہری کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے محض دل بہلانے یا تفریح طبع کے لئے شاعری کا دامن نہیں پکڑا اور اس کا اندازہ ہمیں ان کے یہاں پیش کئے گئے موضوعات اور احساس شدت سے ہو جاتا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ سوچ رہی کہ جو بھی تخلیقات وجود میں آئیں وہ معاشرے کے لئے مفید ہوں۔ تہذیب و معاشرے کی فکر انہیں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ جس کے سبب ان کے مضامین فطری اور جاندار معلوم پڑتے ہیں اور حقیقت سے قریب نظر آتے ہیں۔

جمیل مظہری کے نگارخانے میں یوں تو ایک سے بڑھکر ایک نادر تخلیقات کی طویل فہرست ملتی ہے۔ 'نقشِ جمیل' جو کہ نظموں کا مجموعہ ہے اور پہلی بار پٹنہ سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور فوراً ہی ہر خاص و عام میں مقبول ہو گیا۔ خاص طور سے اس میں شامل وہ نظمیں جو رومانیت سے لبریز حقیقت پسندی کی مثالیں پیش کر رہی ہیں۔ ان میں عشقِ ناتمام، سلامِ ماضی، کہانی، یہ کیا ہوا تم کو اور ڈرو خدا سے ڈرو ان کے عہدِ شباب کے بہترین نمونے ہیں۔ 'ڈرو خدا سے ڈرو' تو ساری نظموں میں شاہکار کا درجہ

رکھتی ہے۔ عذرا ایک پاکیزہ ذہن، نیک سیرت اور خدا سے ڈرنے والی عورت ہے جسے نہ صرف آخرت کا یقین ہے بلکہ اسے اپنے ہر عمل کا احساس بھی ہے۔ ویسی باحیا عورت کو اس کے محبوب سے جدا کر کے زمانے کی بے حسی نے اپنے سے زیادہ عمر کے شخص کے ساتھ بیاہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسے حالات میں جب اسے اپنے محبوب کی یاد آتی ہے تو وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے محبوب کو بھی یہ تلقین کرتی ہے کہ اب تم یاد نہ آیا کرو اور خدا کا خوف کرو۔ ایک بے بس، مجبور اور سماجی مظالم کی شکار ایک عورت کی ناانصافی کا جیتا جاگتا نمونہ جمیل مظہری کی یہ نظم کسی بھی ہوش مند انسان کی روح تک کو گھائل کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ جس طرح سے ایک مظلوم عورت کی لاچاری اور اس کی نفسیاتی کشمکش کی حقیقی تصاویر علامہ نے پیش کیا ہے وہ ان کی سماجی شعور اور دردمندی کا بہترین اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ چند بند ملاحظہ کریں۔

ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلے ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

جو پاس چولہے کے امّاں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دیوانہ بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

جو بجھ رہا ہوں سرِ شام وہ دیا ہوں میں
تبسّمِ لب مایوس مدعا ہوں میں
حیا کے دوش پہ اک میّت وفا ہوں میں
مرے قریب نہ آؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے نہ یاد کرو

ڈاکٹر اختر اورینوی کا خیال ہے کہ ''جمیل مظہری اپنی غزلوں کے موضوع و مزاج میں بڑے استوار ہیں۔'' ان کی غزل گوئی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا ابتدائی دور ہے جس میں قدامت پسندی نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درجِ ذیل ہیں۔

چلمن کبھی کبھی تو اٹھایا کرے کوئی۔ کچھ احترام دیدہء بینا کرے کوئی۔
شرطِ وفا ہے یہ تو وفا کو مرا سلام، دل اس لئے نہیں ہے کہ کھیلا کرے کوئی۔

جمیل مظہریؔ کی غزل گوئی کا دوسرا دور وہ ہے جب ان کے فن میں بتدریج پختگی آنا شروع ہوگئی تھی۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھنے والوں نے سمجھا مری منزل اس کو،
میں جہاں بیٹھ گیا حسرتِ منزل لے کر۔

اوران کی شاعری کا تیسرا دوران کے فکر وفن کی مکمل پختگی کا دور تھا اور اسی دور کی شاعری نے ان کو شہرت بھی عطا کی اور عظمت بھی۔ ذیل کا یہ شعران کی اسی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

ہے خیر وشر میں صلح کا امکاں ابھی تلک،
ابلیس ہے معلم انساں ابھی تلک۔

جمیل مظہریؔ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیات میں حب الوطنی، قوم پرستی اور سیاسی وانقلابی نوعیت کا حامل ہونا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی باتیں اس دور کی عام روش تھی۔ اس وقت ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا۔ اپنے خیالات اور نقطہ نظر کے اعتبار سے بھی ان کی نظمیں ترقی پسند اور تعمیری خیالات کے ہیں۔ ان کی نظم 'مزدور کی بانسری' سرمایہ دارانہ کشمکش کے پس منظر میں کہی گئی ایک پر اثر نظم ہے۔ 'جشنِ آزادی' اور 'یوم آزادی' سیاسی پس منظر میں کہی گئی نظمیں ہیں۔ جمیل مظہریؔ کی درجِ ذیل اشعار سے ان کی حب الوطنی، قوم پرستی اور وطن دوستی کی بات واضح ہوتی ہے:-

ہر جگہ خلاؤں میں اک مکاں بنانا ہے۔ اس زمیں کی مٹی سے آسماں بنانا ہے۔
پھول چن رہے ہو کیا خار وخس چنو پیارو، آشیاں بنانا ہے آشیاں بنانا ہے۔
آؤ ساتھیو آؤ گاؤ ساتھیو گاؤ، اس سکوتِ صحرا کو اک فغاں بنانا ہے۔

جمیل مظہریؔ کی قومیت، وطن دوستی، جمہوریت شعاری اور محکوموں اور محنت کشوں سے ان کے والہانہ لگاؤ ہونے کے باوجود ان کی شاعری پر مارکسی نظریات اور اشتراکی خیالات کا غلبہ نہیں رہا ہے۔ اس کے برعکس ان کی حق شعاری، انصاف طلبی، جمہور پسندی اور انسان دوستی ایک ایسے صالح اور صحت مند قومی نقطہء نظر کی حامل رہی ہے جس پر سرسید احمد خاںؔ، اقبالؔ اور گاندھی جیؔ کے افکار ونظریات کا ملا جلا اثر نمایاں ہے۔ ان کی نظم 'فریاد' کے درجِ ذیل بند سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:-

عشق اور عقل میں پھر جنگ کا ساماں ہے آج۔
کہ عقائد سے جنوں دست گریباں ہے آج۔
خاک افسردہ میں پھر شورش طوفاں ہے آج۔
ذہن تشکیک کا شیرازہ پریشاں ہے آج۔

دلِ شاعر میں سوالوں کے حباب اٹھتے ہیں،

آندھیاں تیز ہیں ذرّات سراب اٹھتے ہیں۔

جمیل مظہری کے نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے اوران کی نظمیں اس کا صاف صاف پتہ دے دیتی ہے کہ وہ علامہ اقبال سے کافی متاثر نظر آتے ہیں لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کا دور اقبالؔ کی شاعری کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے اس لئے وہ علامہ اقبالؔ کے اثرات کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہیں۔ جمیل مظہریؔ غالبؔ کی شاعری کی کائناتی وسعت اوراس کے تغزل سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں ایک ساتھ مرزا غالبؔ اوراقبالؔ کا رنگ صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے:-

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

ہراک خواہش کا ماتم کرکے اس دنیا سے ہم نکلے۔

کچھ نہ تھا تو کچھ نہ ہوتا عقل کس دھوکے میں ہے۔

پردہ کچھ اعلان کرتا ہے کہ کچھ پردے میں ہے۔

مختصر یہ ہے کہ منزل تک کوئی پہنچا نہیں،

عقل بھی رستے میں ہے اور عشق بھی رستے میں ہے۔

اللہ بچائے اس بے خودی سے، جو بھیس لئے ہو خودی کا۔

اقبالؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات میں فارسی تراکیب کا بھرپور استعمال ہے۔ ان کی نظموں میں عقل، عشق، دل، خودی، حکمت اوراس قبیل کے دوسرے الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبالؔ کی طرح ہی جمیل مظہریؔ نے بھی فارسی ترکیبیں خوب استعمال کی ہیں۔ اقبالؔ کے مقابلے میں جمیل مظہریؔ کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے اشعار میں لفظوں کی تکرار نہیں ملتی۔ آپ نے دیکھا کہ مذکورہ بالا اشعار میں جمیل مظہریؔ بھی انھیں لفظوں کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں جو اقبالؔ کے یہاں بار بار آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ذیل میں چند اور اشعار نقل کئے جارہے ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جمیل مظہریؔ کی شاعری پر اقبالیات کے اثرات مرتب ہوئے ہیں:-

حکمت کی رہبری میں پرواز کی امنگیں،

امکاں کے دائروں کو پھیلا کر بڑھ رہی ہیں۔

وہ قوتیں جواب تک تحتِ شعور میں تھیں،

گہوارہ ءخودی میں پروان چڑھ رہی ہیں۔

جمیل مظہریؔ کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان کی شاعری اور غزل گوئی درد دہلویؔ، شادؔ عظیم آبادیؔ اور علامہ اقبالؔ کے افکار سے وابستہ ہے اور اسلوب کے لحاظ سے ان کی شاعری غالبؔ، شادؔ عظیم آبادیؔ اور وحشتؔ لکھنویؔ سے متاثر نظر آتی ہے۔ فن کے اعتبار سے غزل کے اشعار مفرد ہوتے ہیں جن میں قافیہ اور ردیف کے ذریعہ حسن کاری پیدا کی جاتی ہے لیکن جمیل مظہریؔ نے غزل کو مکمل شعری اکائی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک غزل ایک مربوط کلام ہے۔ وہ اپنی غزل کو روایتی غزل سے الگ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ خود فرماتے ہیں کہ:-

'میں ہمیشہ سے یہ کہتا آیا ہوں کہ غزل افکارِ منظوم کا نام نہیں ہے اس لئے میری غزلوں پر غزل کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں مشاعروں میں بہت کم شریک ہوا اور اپنی غزلیں اخبار اور رسائل کو بہت کم دیں۔ شہرت کی ہوس کس کو نہیں ہے لیکن مرا احساسِ کمتری جو شاید مرے غرور کی پیداوار ہو ظہوری کے مقابل میں خفائی رہنے ہی پر قانع رہا۔'

جمیل مظہریؔ کی شاعرانہ عظمت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قدیم شعری سرمایہ کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ شاعری کی کلاسیکی روایت سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کی شاعری موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے قدیم و جدید کا ایک دلکش امتزاج پیش کرتی ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں جذباتی تفکر اور فلسفیانہ ٹھہراؤ کی آمیزش ملتی ہے۔ چونکہ وہ عہدِ جدید کے نئے تصورات کو قبول کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم، مرثیہ ہو یا قصیدہ یا مثنوی موجودہ عہد کے شعور سے پوری ہم آہنگی رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں اظہارِ خیال پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا مزاج عطا کیا اور اس کا انھیں خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

یہ کس نے چھیڑا ستارا اپنا کہ تھم گیا کاروانِ انجم
رکی ہے فطرت کی دل کی دھڑکن کھڑا ہے سکتے میں خود زمانہ۔
لکھے نہ کیوں نقش پائے ہمت قدم قدم پر مرا فسانہ
میں وہ مسافر ہوں جس کے پیچھے ادب سے چلتا رہا زمانہ۔

ڈاکٹر سورج دیو سنگھ
صدر، شعبہ اردو، مگدھ مہیلا کالج
پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

کتابیات:-

(۱)

(۲)

(۲)

(۳)

(۴)

(۵)